

- فکر قرآنی کے چار سلسلوں کا قرآن
- چاروں سلسلوں کی بعض اہم شخصیتوں
- سے ذاتی روابط اور _____
- دو اہم شخصیتوں سے وصل و فصل
- کی داستان۔

© rasailojar

© rasailojar

ان سطور کے ناکارہ و ناچیز راقم کو اپنی اس خوش بخشی پر ناز ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے نوجوانی ہی کے دور میں ایسے مواقع پیدا فرما دیئے کہ وہ نہ صرف یہ کہ اپنی بساط کے مطابق فخر قرآنی کے تذکرہ بالائتینوں درمیانی دھاروں سے متعارف و مستفید ہوا بلکہ حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمے اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے حواشی کی وساطت سے اس کا ذہنی رشتہ کم از کم تفسیر قرآن کی حد تک ان علماء ربانین کے حلقے سے بھی قائم ہو گیا۔ جو بلاشبہ اہل علم و فضل کے مستحق ہیں۔ نتیجہً بفضل اللہ و عونہ اس کی ذات میں بقدر وسعت ظرف ان 'انہار ثلثہ' کے ساتھ ساتھ یہ چوتھا چشمہ صافی بھی رواں دواں ہے۔ ————— فلا الحمد والمنۃ۔

جذباتی سطح پر راقم کی شخصیت پر سب سے پہلی اور سب سے گہری چھاپ علامہ اقبال مرحوم کے اردو کلام کی ہے۔ چنانچہ ہائی اسکول کا پورا زمانہ طالب علمی (۱۹۴۱ء تا ۱۹۴۷ء) احقر نے بانگ درا، بال جبریل، ضرب کلیم اور ارغوانِ حجاز کے اشعار پڑھتے اور گنگنااتے ہوئے بسر کیا۔ جس سے ایک جذبہ ملی اس کے رگ و پے میں سرایت کر گیا اور چونکہ اس وقت اس جذبے کے مظہر اٹم کی حیثیت تحریک پاکستان کو حاصل تھی لہذا اس دور میں اپنی بساط کے مطابق عملی و اشکی تحریک مسلم لیگ کی تنظیم طلبہ یعنی مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے ساتھ رہی۔ تاہم اسی دور کے اواخر میں راقم مولانا ابوالاعلیٰ مودودی سے بھی متعارف ہو چکا تھا اور اہلال اور ابلاغ والے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم سے بھی۔ ————— مولانا مودودی کی تحریروں میں سے یوں تو جو کچھ بھی اس وقت پڑھنے میں آیا بھلا ہی لگا لیکن الحمد للہ کہ ان کے ساتھ راقم کا اصل ذہنی و قلبی رشتہ 'تفہیم القرآن' کے ذریعے قائم ہوا جس کے ضمن میں تقسیم ہند

کے قریب کے زمانہ میں میر تقی میر نے اس کا نسخہ لکھا تھا۔
 ذہنی و قلبی تعلق کی گہیری کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ تقسیم ملک کے ہنگاموں اور
 آگ اور خون کی وادیوں سے گزر کر جیسے ہی پاکستان پہنچنا نصیب ہوا راقم ان کی تحریک سے
 وابستہ ہو گیا اور ایک جانب تو اس نے چند ماہ کے اندر اندر ان کے قلم سے نکلا ہوا ایک
 ایک لفظ اس طور سے پڑھ ڈالا کہ مولانا محمد اسماعیل گوجرانوالوی کے الفاظ میں نہ صرف یہ کہ
 ان کی تصانیف کا فارغ التحصیل ہو گیا بلکہ ان کا مدرس بھی بن گیا۔ اور دوسری طرف زمانہ
 طالب علمی کے بقیہ سات سال (۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۴ء) ان کی تحریک اسلامی کے نذر کر دیئے
 اور اپنی بیشتر قوتیں اور توانائیاں اسلامی جمعیت طلبہ کے ساتھ عملی وابستگی میں کھپا دیں۔
 اس دور کے تقریباً وسط میں (۵۰-۱۹۵۱ء کے لگ بھگ) راقم کا ذہنی رابطہ مولانا امین احسن
 اصلاحی سے قائم ہوا۔ مولانا کی تحریروں کے بارے میں جماعت اسلامی کے حلقوں میں عام
 طور پر یہ مشہور تھا کہ وہ ثقیل بھی ہوتی ہیں اور خشک بھی، لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے
 جو قلبی انس راقم کو اس وقت تک قرآن مجید کے ساتھ حاصل ہو چکا تھا اس کی بنا پر اسے ان
 تحریروں میں نہ ثقل کا احساس ہوا نہ خشکی کا۔ مولانا کی تحریریں بھی یوں تو راقم نے سب ہی پڑھ
 ڈالیں لیکن ان کی دو تصانیف سے تو اسے عشق کی حد تک لگاؤ ہو گیا۔ ایک 'دعوت دین اور
 اس کا طریق کار' اور دوسری 'تدبر قرآن' (جواب 'مبادی تدبر قرآن' کے نام سے مطبوعہ موجود ہے)
 مولانا کی ان تصانیف کے مطالعے سے بلاشبہ ریب و شک راقم کے قرآن حکیم کے ساتھ
 ذہنی تعلق میں ایک نئے بعد و عرض (DIMENSION) کا اضافہ ہوا اور پھر جب ۱۹۵۴ء
 کے لگ بھگ مولانا کا ترجمہ کردہ 'مجموعہ تفاسیر فراہی' شائع ہوا تب تو راقم کو تفسیر قرآن کے
 اس محنت فکری کے اصل منبع و سرچشمہ تک رسائی حاصل ہو گئی فلہذا احمد — اسی زمانہ طالب
 علمی کے دوران احقر حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمے اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے حواشی سے
 متعارف ہوا یاد ہوگا، اس کا ایک نہایت اعلیٰ اور حسین و جمیل ایڈیشن کراچی کے بعض اہل خیر
 نے ہانگ ہانگ سے طبع کر کے مفت تقسیم کیا تھا جو بعد میں فی نسخہ پانچ روپے سے لے کر
 تیس روپے تک میں فروخت بھی ہوتا رہا! مولانا عثمانیؒ کے بظاہر حد درجہ سادہ و سلیس حواشی

شدہ نتائج بالکل ذرا مل ہو جاتے۔ اللہ کے فضل و کرم سے ہر نیا انداز فکر سابق فکر میں ایک نئی شان پیدا کرتا چلا گیا۔ اور یہ عمارت اپنے اطراف و جوانب سمیت بلند ہوتی گئی۔ اس ہمہ جہتی استحکام و ارتقار کے ضمن میں واقعہ یہ ہے راقم سب سے بڑھ کر مرہونِ ملت ہے علامہ اقبال مرحوم کے فارسی کلام کا جس کے اعتبار سے علامہ موصوف یقیناً 'رومی ثانی' بھی ہیں اور مجتہد 'ترجمان القرآن' بھی۔ اور اس سلسلے میں شدید نا انصافی ہوگی اگر ذکر نہ کر دیا جائے کہ ابتدائی پانچ سالوں کے دوران راقم کو فائدہ پہنچا مولانا برکات احمد خاں مرحوم (ڈوئٹھی ٹیم سائیہوالی) کی علمی سے اور بعد کے دس سالوں کے دوران فیض حاصل ہوا پروفیسر یوسف سلیم خشتی مرحوم و مغفور کی صحبت

الغرض۔۔۔ راقم کے فکر و نظر پر ھُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ کے

مصدق ابتدائی اور تکمیلی چھاپ تو ہے علامہ اقبال مرحوم کی۔ ان میں

سے ابدی نامور زیادہ تر جذباتی ہے جس کا حاصل ہے جذبہ ملی اور

تکمیلی رنگ خالص فکری ہے جس کا موضوع ہے فکر جدید کے پس منظر

میں قرآن حکیم کا مطالعہ یا قرآن حکیم کی روشنی میں فکر جدید کا جائزہ و تجزیہ۔

اور ان کے مابین رواں ہیں مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم اور سید ابوالاعلیٰ

مودودی مرحوم و مغفور کی قرآنی دعوتِ جہاد و انقلاب اور امام حمید الدین فراہی

اور مولانا امین احسن اصلاحی کے طریق تدبر قرآن اور حضرت شیخ الہند اور

مولانا شبیر احمد عثمانی کے علمِ راسخ کے کوثر و تسنیم ایسے چشمے۔۔۔

ذَلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ط

راقم حیران ہے کہ کس منہ سے اور کن الفاظ میں اللہ کا شکر ادا کرے۔ ایک

ان پڑھ یا نیم خواندہ انسان پر جسے اپنی نسبت 'اُمیّت' پر فخر ہے انعامات

اکرامات کی یہ بارش! بقول ملک نصر اللہ خاں عزیز مرحوم ع

"اک بندہ عاصی کی اور اتنی مدار تیں!"

حیثیت ہی سے سہی مشرقی پنجاب کے ایک ضلع (حصار) کے مختلف قصبات (سرسہ، ہانسی وغیرہ) کے ہائی اسکول کے طلبہ کے مابین ایک رابطہ استوار کرنے کی سعی میں مشغول تھا۔ بعد ازاں ان کے تفسیری حاشی کی بدولت ان کی جو معنوی صحبت حاصل رہی اس کا ذکر اوپر ہو ہی چکا ہے۔

مولانا عثمانیؒ کے رفیق کار اور معتمد خاص مولانا مفتی محمد شفیعؒ سے ملاقات کا شرف البتہ راقم کو حاصل رہا اور ان کی شفقت و محبت سے بھی اس عاجز نے حصہ پایا۔ مولانا انور شاہ کاشمیریؒ کے شاگرد رشید مولانا محمد یوسف بنوریؒ کی نیاز مندی کی سعادت بھی راقم کو حاصل رہی اور ان کی اور نظر کرم بھی اس ناپسند کا سرمایہ افتخار رہی۔ حضرت شیخ الہندؒ کے فیض کے دوسرے دو چشموں سے بھی راقم بجز اللہ بیگانہ و نابلد نہیں۔ مولانا حسین احمد مدنیؒ کے خلیفہ مولانا سید حامد میاں مدظلہ، اور مولانا سندھی مرحوم کے شاگرد رشید مولانا احمد علی لاہوریؒ کے خلف الرشید مولانا عبید اللہ انورؒ کی نیاز مندی اور کلمے کا ہے ان کی خدمت میں حاضری کا شرف بھی راقم کو حاصل رہا گویا:

الزاسخون فی العلم کے اس سلسلے کے ساتھ راقم کا معاملہ اس عربی شعر کے مصداق رہا کہ

أَحَبُّ الصَّالِحِينَ وَلَسْتُ مِنْهُمْ لَعَلَّ اللَّهَ يُؤْزِقُنِي صَلَاحًا

علامہ اقبالؒ کے انتقال کے وقت بھی راقم کی عمر چھ برس تھی لیکن اب یہ بات خود اس عاجز کو نہایت عجیب اور حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے کہ ان کے انتقال کو راقم نے ایک ذاتی صدمے کی حیثیت سے محسوس کیا تھا۔ اس کی ایک ہی توجیہ ممکن ہے اور وہ اس حدیث نبویؐ کی روشنی میں کہ اس عالم فانی میں آنے سے قبل عالم ارواح میں جن ارواح کے مابین انس پیدا ہو جاتا ہے ان کے مابین مودت کا رشتہ اس عالم اجساد میں بھی برقرار رہتا ہے۔ بہر حال علامہ مرحوم کے ساتھ راقم کا قلبی تعلق کم و بیش ”مِنَ الْمَهْدِ إِلَى اللَّحْدِ“ والا ہے۔ اور اوپر عرض کیا ہی جا چکا ہے کہ راقم کے شعور کی تحتانی سطحوں میں سے سب سے نچلی تہہ پر نقوش ثبت ہیں علامہ مرحوم کے اردو اشعار کے اور اس کے فکر کی بلند ترین سطح پر کندہ ہیں نقوش ان کے فارسی کلام کے۔

یہی وجہ ہے کہ جب راقم کی ملاقات فلسفہ اقبال کے مَدُون و شارح، اور حکمت اقبال کے مصنف ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم سے ہوئی تو دونوں ہی نے یہ محسوس کیا کہ وہ ایک دوسرے سے

بہت پہلے سے واقف ہیں۔ اور جب بھی گشتگو ہوتی یہی محسوس ہوا کہ

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا میں نیچے جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

۱۹۶۷ء سے ۱۹۶۹ء تک تقریباً ڈھائی سال نہایت قریبی تعلق راقم کو ڈاکٹر صاحب مرحوم سے حاصل رہا۔ (مِثاق کے اس دور کے فائل اس پر شاہدِ اول ہیں) اُس زمانے میں ”اسلام کی نشاۃ ثانیہ“ کرنے کا اصل کام ”راقم کے قلم سے نکل کر شائع ہو چکا تھا۔ اس کی حرف بحرف تصویب ڈاکٹر صاحب نے فرمائی اور ”مِثاق“ کے لیے اپنی تصنیف ‘MANIFESTO OF ISLAM’ کا ترجمہ اردو میں

خود ہی کرنا شروع کر دیا جس کی چند ہی قسطیں چھپنے پائی تھیں کہ

”اں قدح بشکست و اں ساقی نمائند“

والاعمال ہو گیا۔ یخفر اللہ لنا ولہ ویدخلہ فی رحمۃہ۔

اسی طرح کلامِ اقبال کے شائع پر و فیسرفیسر سلیم حشتی مرحوم و مغفور سے جو ذاتی ربط و تعلق ۱۹۶۶ء میں استوار ہوا تھا وہ بعد اللہ ان کی وفات تک قائم رہا (یہاں تک کہ بعض واقفینِ حال تو واقعہ حیرت کا اظہار کرتے رہے کہ پرو فیسر صاحب ایسے نازک طبع اور تنک مزاج بزرگ سے راقم کا تعلق کیسے نبھ رہا ہے) پرو فیسر صاحب نے راقم کی تحریر ”نشاۃ ثانیہ“ کرنے کا اصل کام کی جو مفصل تائید و تحسین تحریر کی تھی وہ تو بہت سے لوگوں کے علم میں ہے، زبانی جو کچھ فرمایا تھا اسے اس خوف سے نقل نہیں کر سکتا کہ اسے خود ستانی پر محمول کیا جائے گا۔

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کا انتقال ویسے تو ۱۹۵۸ء میں ہوا۔ لیکن راقم کو جس ابوالکلام سے دلچسپی تھی یا ہے یعنی ”الہلال“ اور ”البلاغ“ والا ابوالکلام جس کے بارے میں کمالِ وسعتِ ظرف کا ثبوت دیتے ہوئے فرمایا تھا حضرت شیخ الہندؒ نے کہ ”اس نوجوان نے ہمیں ہمارا بھولا بھوا سبق یاد دلادیا! وہ واقعہ ۲۱-۱۹۲۲ء کے لگ بھگ ہی وفات پا چکا تھا اور اس کے معنوی خلیفہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے جب اس کے ترک کردہ مشن کی تکمیل کا بیڑا اٹھایا تو اسے بجا طور پر اس کی زندگی ہی میں ”مرحوم“ قرار دے دیا تھا۔ تاہم مولانا مرحوم کو دیکھنے کی تمنا راقم کے دل میں مستقل پر رہی جسے دو ملکوں کے فاصلے نے بالآخر ۱۹۵۸ء میں حسرت میں تبدیل کر دیا۔

عجیب اتفاق ہے کہ جس سال مولانا مودودی نے مولانا آزاد مرحوم کی تفسیر کے ہم نام ماہنامے 'ترجمان القرآن' کی ادارت سنبھالی وہی راقم کاسن پیدا لٹش ہے اور مولانا آزاد کے انتقال کا زمانہ لگ بھگ وہی ہے جب کم و بیش دس سال کی ہم سفری کے بعد راقم کی راہ مولانا مودودی کے رستے سے جدا ہوئی۔

مولانا مودودی مرحوم و مغفور کے ساتھ راقم کے وصل و فصل کی داستان نہایت طویل ہے۔ مختصر یہ کہ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۷ء تک نہایت قریبی تعلق راقم کو مولانا کے ساتھ حاصل رہا۔ ان میں سے ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۳ء تک کے دو سالوں کے دوران جبکہ راقم اسلامی جمیعت طلبہ کے صفِ اول کے کارکنوں میں سے تھا، مولانا سے قُرب کا یہ عالم تھا کہ راقم جب چاہتا تھا مولانا کی خدمت میں حاضر ہو جاتا تھا۔ یہاں تک کہ بعض مواقع پر فوری مشورے کے لیے راقم الحروف نے مولانا سے نصف شب کے لگ بھگ اُن کی خراب گاہ میں بھی ملاقات کی۔ ۵۵ء میں راقم جماعت اسلامی کارکن بنا اور برقی سے اس کے فوراً بعد ہی اس نے شدت کے ساتھ محسوس کر لیا کہ جماعت اسلامی کی تحریک اپنی اصل اساسات سے منحرف ہو چکی ہے۔ اواخر ۱۹۵۶ء میں راقم نے اپنا وہ مفصل بیان سپردِ قلم کیا جو اب 'تحریک جماعت اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ' کے نام سے مطبوعہ موجود ہے، 'فروری ۱۹۵۷ء' میں اجتماعِ ماچھی گوٹھ میں راقم نے اپنا نقطہ نظر پیش کرنے کی ناکام کوشش کی۔ اور حالات کی ستم نظریفی نے اس وقت صورتِ سمجھ ایسی پیدا کر دی کہ گویا مولانا 'لیڈر آف دی ہاؤس' تھے اور یہ خاکسار 'لیڈر آف دی اپوزیشن'! چنانچہ راؤ خورشید علی خان مرحوم نے جو اس زمانے میں جماعت اسلامی کی صفِ اول کے قائدین میں سے تھے، بھرے اجلاس میں باقاعدہ یہ الفاظ کہے بھی تھے کہ "ڈاکٹر سرار کو لیڈر آف دی اپوزیشن کی حیثیت حاصل ہے، انہیں اپنا نقطہ نظر پیش کرنے کے لیے پورا وقت ملنا چاہیئے؟" بہرِ نزع اپریل ۱۹۵۷ء میں راقم نے جماعت کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا۔ اور اس طرح وہ دس سالہ تعلق ختم ہو گیا۔ اب اس 'فصل' کو بھی بیسٹ برس ہونے کو آئے ہیں، اور اس دوران میں بھی اُدبِ پنج کے بہت سے ادوار آئے لیکن ان سب کا حاصل یہ ہے کہ

بس اتنا سا تعلق اب اُن سے رہ گیا ہے وہ مجھ کو جانتے ہیں، میں اُن کو جانتا ہوں

آج سے تقریباً دس سال قبل جب رحیم یار خاں میں جماعت اسلامی سے علیحدہ ہونے والے

چند حضرات کے اجتماع میں ایک نئی اسلامی تنظیم کے قیام کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ راقم نے بعض معروضات، میثاق کے صفحات میں مولانا مودودی کی خدمت میں پیش کی تھیں۔ راقم کے احساسات اب بھی بالکل وہی ہیں اور اب جبکہ تنظیم اسلامی کے نام سے ایک چھوٹا سا قافلہ دوبارہ تشکیل پا کر سفر کا آغاز کر چکا ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان معروضات کو من و عن دہر دیا جائے۔ وَهُوَ هَذَا:

”اس موقع پر بالکل ذاتی حیثیت میں ایک گزارش راقم الحروف جماعت اسلامی کے بزرگوں خصوصاً مولانا مودودی کی خدمت میں کرنا چاہتا ہے۔ گزشتہ ڈیڑھ دو سال کے دوران راقم الحروف کے بعض اقدامات اور اس کی بعض تحریروں سے یقیناً آپ کو شدید تکلیف پہنچی ہوگی۔ لیکن خدا شاہد ہے کہ دل کے کسی بعد ترین گوشے میں بھی ان میں سے کسی اقدام یا تحریر سے آپ کی دل آزاری ہرگز مقصود نہ تھی۔ راقم الحروف کے دل میں اظہارِ دین حق اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کا جذبہ آپ ہی کی تحریروں سے پیدا ہوا۔ اسی جذبے سے سرشار ہو کر طالب علمی کے قیمتی اوقات اور عمر عزیز کے بہترین لمحات آپ کے بتائے ہوئے طرے پر جدوجہد کی نذر کیے۔ پھر جب محسوس ہوا کہ آپ غلط رخ پر چل نکلے ہیں تو ایک بیان کی صورت میں جس کا واسطہ دے سکوں، آپ ہی کی شفقتیں اور عنایتیں ہیں جن کا واسطہ دے کر آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ میرے اس بیان کو پڑھ فرمائیں۔“

”باہمی گٹھ کے بھرے اجتماع میں سیلج پر اعلان کیا کہ: ”اگر مجھے اپنے موقف کی صحت کا یقین ہے اور امیر جماعت کی طویل تقریر میں مجھے کوئی روشنی نظر نہیں آتی۔ تاہم میں جماعت میں شامل رہوں گا اس لیے کہ اس کے بغیر میں اپنے وجود کا تصور بھی نہیں کر سکتا؛ لیکن پھر جب کچھ آپ کی ”عنایتوں“ میں مزید اضافہ ہوا اور آپ نے اہل اختلاف پر ضعف ارادہ، لیسٹ اور ضعف ارادہ مرکب کی چھتیاں صحت کرنی شروع کیں اور کچھ یہ محسوس ہوا کہ جماعت میں عضو مغل کی حیثیت سے رہنا آخر چر سود ہے تو یہ کہتے ہوئے ایک بھاری دل کے ساتھ جماعت سے علیحدگی اختیار کر لی کہ: ”میں جانتا ہوں کہ جماعت کے بہت سے بزرگ مجھ سے بزرگ نہ شفقت کا اور کتنے ہی ارکان و متفق مجھ سے حقیقی محبت کا تعلق رکھتے ہیں۔ جب میں سوچتا ہوں کہ آج اپنے اس اقدام سے میں نہ معلوم کتنوں کے جذبات مجروح کروں گا تو اپنے ہی آپ میں ایک ندامت کا احساس بھی ہوتا ہے۔ لیکن اس سب کے باوجود اس اقدام پر مجبوراً اس لیے آمادہ ہو گیا کہ اب اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نظر نہیں آتا۔“

”علیحدہ ہونے کے بعد بھی کم و بیش پانچ سال تک شدید اختلاف کے باوجود آپ کے ساتھ وہی قلبی تعلق قائم رہا جو ایک احسان مند کا اپنے محسن سے ہوتا ہے۔ چنانچہ ۱۹۶۲ء میں حج کے لیے روانہ ہونے سے قبل آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی اس قلبی کیفیت کا اظہار بھی کیا تھا۔ افسوس کہ اس کے فوراً بعد آپ کے دو اقدامات یعنی ایک خلاف کعبہ کے سوانگ اور دوسرے سہروردی مرحوم سے ربط و تعلق کی بدولت دل کی یہ کیفیت برقرار نہ رہی اور ذہنی دوری کے ساتھ ساتھ ایک ایسا قلبی بُد بھی قائم ہو گیا جس میں رنج کے ساتھ غصے کی بھی آمیزش تھی۔ اب

”خلافت و ملکیت“ لکھ کر عمر کے آخری حصے میں ہو کماٹی آپ نے کی ہے اُس کی وجہ سے غصے کی جگہ حسرت نے لے لی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اب آپ کے بارے میں سوچتے ہوئے دل کا پینے لگا ہے اور دل کی گہرائیوں سے یہ دعا نکلنے لگتی ہے کہ: — دِنًا لَا تَزُغُ قُلُوبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ — ہاں ہر اب جب کہ ہم آپ کے کچھ قدیم ساتھی، رفیق اور نیاز مند دین کی چھوٹی بڑی خدمت کے ارادے سے جمع ہو رہے ہیں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اپنے خیال کے مطابق ہم آپ ہی کے ترک کردہ مشن کے لیے اٹھ رہے ہیں۔ اس شیرازہ بندی سے مقصود ہرگز آپ کی مخالفت نہیں ہے۔ اگرچہ فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کہ ”الَّذِي يُبْغِي النَّصِيحَةَ“ کی رو سے آپ کی جن باتوں کو ہم غلط سمجھتے ہیں ان پر لامحالہ تنقید کرنی ہوگی تاہم اس سے مقصود سوائے اصلاح کے اور کچھ نہ ہوگا۔

مولانا حمید الدین فراہی کا انتقال بھی راقم کی پیدائش سے تقریباً ڈیڑھ سال قبل ہو گیا تھا۔ اور غلامی ۱۳۵۱ھ تک راقم مولانا کے نام تک سے واقف نہ تھا۔ بعد میں جب مولانا امین احسن اصلاحی کی وساطت سے ان سے تعارف ہوا اور ان کی تحریریں بھی دیکھنے میں آئیں اور ان کے حالات زندگی بھی معلوم ہوئے تو اندازہ ہوا کہ واقعہً ایک نہایت عظیم ہستی تھی جو نہایت خاموشی کے ساتھ قرآن حکیم پر غور و فکر اور تدبر و فکر کی ایک بالکل نئی طرح ڈال کر رخصت ہو گئی۔ ان کی شخصیت کا جو ہیولی راقم الحروف کے تصور میں ابھرتا ہے وہ سقراط سے بہت مشابہ ہے۔ ایک حکیم و دانا اور نیک و پارسا انسان جو لوگوں کی تعریف و تحسین اور تنقید و ملامت دونوں سے یکساں بے نیاز ہوا اور یا تو خاموش تعقل و تفکر میں غرق ہو یا اپنے چند شاگردوں کو نہایت دھیمے طریق پر اور مکالمے کے سے انداز میں اس طرح درس دے رہا ہو جیسے کوئی بزرگ کسی بچے کی انگلی پکڑ کر اسے چلنا سکھاتا ہے اور راقم اسے اپنی بہت بڑی خوش قسمتی سمجھتا ہے کہ اسے حکیم فراہی کا نہ سہی ان کے شاگرد و رشید کا قُرب تقریباً ربع صدی تک حاصل رہا۔

مولانا امین احسن اصلاحی کے ساتھ تعلق کا آغاز تو مولانا مودودی کی طرح ۱۹۴۷ء ہی میں ہو گیا تھا۔ (بلکہ راقم نے مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی دونوں کو پہلی بار ۱۹۴۶ء میں دارالاسلام ٹھکانوٹ میں دیکھا تھا! جہاں وہ اپنے بڑے بھائی اظہار احمد صاحب کی معیت میں حاضر ہوا تھا، لیکن ۱۹۵۱ء تک یہ تعلق کُلیہً ایک طرف تھا یعنی صرف ان کی تقریریں اور درس سُن لینے تک محدود تھا۔ تا آنکہ نومبر

۱۹۵۱ء کی ایک شام کو دوائی، ایم، سی، اے ہال لاہور میں راقم نے اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان کے تیسرے سالانہ اجتماع کے موقع پر مولانا کے زیرِ صدارت اپنی وہ پہلی عوامی تقریر کی جو اب تک جمعیت کے دعوتی طریقہ کار کا اہم جزو ہے اور ہماری دعوت اور ہمارا طریقہ کار کے عنوان سے طبع ہوتی ہے۔ راقم کی اس تقریر کی تعریف و تحسین مولانا نے دل کھول کر فرمائی — اور یہیں سے وہ ایک طرف تعلق، باقاعدہ، دوطرفہ تعلقات میں تبدیل ہو گیا — دسمبر ۱۹۵۱ء اور جولائی ۱۹۵۲ء میں جمعیت طلبہ کی دو تربیت گاہوں میں راقم ناظم کی حیثیت سے شریک رہا اور مولانا معلم و مربی کی حیثیت سے اس سے ان تعلقات کی گہرائی و گیرائی میں نمایاں اضافہ ہوا — بعد کے چار سالوں کے دوران بے تحلف ملاقاتوں سے یہ تعلق مزید استوار ہوا — ۱۹۵۶ء میں جماعت اسلامی کی مرکزی مجلس شوریٰ کے اجلاس میں مولانا نے راقم کے متذکرہ بالا اختلافی بیانی کی تہنیت سادہ راہ حل میں صوبہ و تائید کی۔ اس طرح جماعت میں پالیسی کے بارے میں جو اختلاف رائے ہوا اس کے ضمن میں بھی ”ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز“ کے مصداق مولانا اور راقم ایک ہی صف میں شامل ہو گئے — ۱۹۵۸ء میں جب مولانا نے بھی جماعت کو خیر باد کہہ دیا اور کسی نئی تعمیر کی فکریں ’مشاورتوں‘ کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا تو اس میں بھی مسلسل ساتھ رہا۔ اور اس سلسلے کا اہم ترین اجتماع عزیز ٹینیر ہٹ پر ہی راقم ہی کے زیرِ اہتمام غالباً چار روز تک جاری رہا۔ لیکن افسوس کہ کوئی متفق علیہ نقشہ نہ بن سکا۔ دسمبر ۱۹۵۸ء میں راقم ان مشاورتوں کی مسلسل ناکامی سے بد دل سا ہو کر ڈاکٹر مسعود الدین حسن عثمانی کی دعوت پر بغیر مولانا کو اطلاع دیتے کراچی منتقل ہو گیا تو ایک حد درجہ محبت بھرا شکوہ مولانا نے اپنے ایک مکتوب میں کیا:

لے ان مشاورتوں پر ایک نہایت دلچسپ چھوٹی اس زمانے میں ملک نصر اللہ خان عزیز مرحوم نے حجت کی تھی۔ بڑوں کے ملک صاحب علیل تھے، راقم اور مولانا نجیم عبدالرحیم اشرف ان کی عیادت کے لیے ان کے پارک لین ٹپل روڈ والے مکان میں حاضر ہوئے تو باتوں باتوں میں ان مشاورتوں کا ذکر بھی آگیا۔ اس پر ملک صاحب نے یہ لطیف سنایا کہ ایک بہت بڑے پر صاحب نے اپنے خلفاء مجاز کی ایک مشاورت طلب فرمائی، اور مشورہ طلب بات یہ پیش کی کہ ”عرسیت کو آوازہ منصور کہن شد! آپ لوگوں کا کیا خیال ہے کیا ہم اس کا اعادہ نہ کر دیں؟“ سب لوگوں نے اپنی اپنی رائے پیش کی کسی نے اثبات میں کسی نے نفی میں، ایک صاحب خاموش رہے حضرت نے ان سے براہ راست استفسار کیا تو انہوں نے مؤدبانہ گزارش کی کہ ”حضرت میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ کیا منصور نے بھی وہ اقدام کسی سے مشورہ لے کر کیا تھا؟“

”آپ کے اس خفیہ اقدام کی اطلاع سیال صاحب سے مجھے پہنچی تھی۔ بہر حال جو کچھ آپ نے کیا اچھا کیا۔ خدا کرے آپ کے مقاصد وہاں پورے ہوں اور آپ کو وہاں دلچسپی کے ساتھ کچھ لکھنے پڑھنے کی فرصت ملے۔ ڈاکٹر صاحب کی رفاقت ان شاء اللہ آپ کے لیے موجب خیر و برکت ہوگی۔ فرزانوں کے ساتھ نباہنا مشکل ہوتا ہے دیوانے گزارے جاتے ہیں۔ آپ دونوں دیوانے ہیں۔ خوب گذرے گی جو مل ٹھیں گے دیوانے دو۔ مجھے جو احساس ہے وہ صرف یہ ہے کہ آپ مجھ سے دور نہ گئے آپ سے ایک قلبی لگاؤ سا ہو گیا ہے۔ اس وجہ سے اس بات سے تھوڑی سی تکلیف ہے کہ میں نے جتنا ہی کھینچنا چاہا اتنے ہی آپ کھینچتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ کھینچتے کھینچتے کراچی پہنچ گئے خیر صاحب جہاں رہو سلامت رہو اور دعاؤں میں ہمیں بھی یاد رکھو۔۔۔“

۱۹۵۹ء میں اس خیال سے کہ محض ایک سادہ تعلق کی بنیاد پر نئی تعمیر ممکن نہیں —

اس کی فکری اساسات کو تفصیل کے ساتھ واضح کیا جانا چاہیئے۔ مولانا نے ماہنامہ ”مِثاق“ جاری فرمایا تو راقم اس کے اولین معاونین میں بھی شامل تھا اور بعد میں بھی مقدمہ و بھر اعانت کرتا رہا اور دوسری طرف دینی و علمی امور کے لیے مولانا صاحب مرحوم کی علالت کے باعث واپسی پر ۱۹۶۰ء میں راقم نے منٹگری (حال ساہیوال) میں ایک اسلامی ہاسٹل قائم کیا اور حلقہ مطالعہ قرآن کی داغ بیل ڈالی تو مولانا نے راقم کے ان کاموں میں بھرپور تعاون فرمایا۔ ہاسٹل کی تجویز پر ایک مفصل تائیدی شدہ ”مِثاق“ میں تحریر فرمایا اور حلقہ مطالعہ قرآن منٹگری کی دعوت پر تقریر کے لیے دوبار ساہیوال کے سفر کی رحمت بڑھتی رہی۔ ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۵ء تک تقریباً چار سال راقم نے دوبارہ ایک دوسرے سلسلے میں کراچی میں بسر کیے۔ اور اس عرصے میں راقم کا رابطہ مولانا سے بہت کم رہا۔ مولانا نے اس دوران میں بعض دوسرے احباب کے ساتھ مل کر مجلس دعوت و اصلاح، کی داغ بیل ڈالی۔ لیکن نہ تو یہ بیل ہی منڈھے چڑھی نہ ہی اجتماعی کام کا کوئی اور نقشہ تیار ہو سکا۔ اس سے بد دل ہو کر مولانا نے ذاتی طور پر حلقہ تدبیر قرآن قائم فرمایا اور اپنی ساری توجہات چند نوجوانوں کی تعلیم و تربیت پر مرکوز کر دیں۔ دوسرے احباب سے ان دنوں مولانا کا رابطہ کمزور پڑتے پڑتے معدوم کے حکم میں آگیا جس کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ ”مِثاق“ نے پہلے تو کچھ عرصے تک ہچکیاں لین اور بالآخر بالکل دم توڑ دیا۔ — یہ حالات تھے جب راقم ۱۹۶۶ء میں دوبارہ وارد لاہور ہوا ”مِثاق“ بند پڑا تھا، تفسیر کی جلد اول تیار تھی لیکن اس کی طباعت و اشاعت کی کوئی سبیل دور دور تک نظر نہ آتی تھی۔ حلقہ تدبیر قرآن میں جن نوجوانوں پر مولانا نے شدید محنت کی تھی وہ سب سلسلہ روزگار تتر بتر ہو گئے تھے۔ ایک صاحب کسی ٹریننگ کے سلسلے میں انگلستان جا

چکے تھے دوسرے صاحب کا تبادلہ دھاکہ ہو گیا۔ بعض دوسرے لوگ بد دل ہو گئے تھے۔ انہیں بالکل
”دشت کو دیکھ کے گھریا آیا“

والاساں تھا۔۔۔۔۔ خود راقم کے سامنے لاہور نقل مکانی میں دو مقصد تھے: ایک حلقہ تدبر قرآن
میں شرکت اور مولانا کے سامنے باضابطہ زانوئے تلمذتہ کر کے ان سے استفادہ اور دوسرے اس
اصل تحریک اسلامی کے احیاء کی سچی جو راقم کے خیال کے مطابق جماعت اسلامی کے انتقالِ حق
کے باعث مردہ ہو چکی تھی۔۔۔۔۔ لاہور اگر اندازہ ہوا کہ مولانا حلقہ تدبر قرآن سے بھی بد دل ہو چکے
ہیں اور اس نہج پر از سر نو محنت کی ہمت اپنے اندر نہیں پاتے۔۔۔۔۔ اور اب سارا وقت
اور ساری محنت تفسیر کی تفسیر پر صرف کر دینا چاہتے ہیں۔ لہذا راقم کا پہلا مقصد توفیق ہو گیا لیکن
ہمت کر کے تدبر قرآن کی جلد اول اس نے شائع کر دی اور مولانا نے ازراہ شفقت اس زمانے
میں یہ اطلاع راقم سے کیا بلکہ دوسرے بہت سے احباب و فقہاء کے سامنے فرمایا ”کہ یہ اس
کا مجھ پر ذانی احسان ہے“ راقم کے سامنے اصل مسئلہ یہ تھا کہ اگر جلد اول شائع نہ ہوئی تو آگے لکھنے
پر مولانا کی طبیعت مائل نہیں ہوگی اور یہ کام ادھورا رہ جائے گا۔۔۔۔۔

دوسرے مقصد کے ضمن میں راقم نے اولاً مولوی محمد الدین سلفی مرحوم کی تحریک پر اور ان کے
تعاون سے اپنا اختلافی بیان ”تحریک جماعت اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ“ کے نام سے شائع کیا۔
اور بعد ازاں ایک باضابطہ دعوت کے آغاز کے لیے ”الرسالہ“ کے نام سے ایک ماہنامے کا
ڈیکلریشن حاصل کر لیا۔ مولانا کو جب اس کی اطلاع ملی تو انہوں نے فرمایا کہ کوئی نیا رسالہ جاری کرنے
کی بجائے ”یشاق“ ہی کو سنبھال لو، میں تو اسے جاری نہیں رکھ سکتا۔ تم شائع کرتے رہو گے تو کم از کم
اس کا نام تو رہے گا۔ ”اِمْتِثَالُ اللَّامِصْر“ راقم نے بہت دھڑ دھوپ سے حاصل کیا ہوا ڈیکلریشن
ضائع کر دیا اور اگست ۱۹۶۶ء سے ”زیر سرپرستی مولانا امین احسن اصلاحی“ یشاق کی ادارت سنبھال لی۔

۱۹۶۶ء، ۱۹۶۷ء کے دوران یشاق کے ذریعے راقم نے ایک طرف تو یہ واضح کیا کہ ۱۹۵۶ء
۱۹۵۷ء میں جماعت اسلامی میں جو اختلاف رائے واقع ہوا تھا اس کی اصل نوعیت کیا تھی اور علیحدہ
ہونے والے علیحدگی اختیار کرنے پر کس طرح مجبور کر دیئے گئے تھے۔۔۔۔۔ اور دوسری طرف
علیحدہ ہونے والوں کو لکھا کہ اگر وہ جماعت اسلامی میں کسی شخصی عقیدت کی بنا پر نہیں بلکہ ”فریضہ

اقامت دین کی ادائیگی کے لیے شامل ہوئے تھے تو جماعت سے علیحدگی سے وہ فرض تو ساقط نہیں ہو گیا۔ ان کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے دینی فرائض کی ادائیگی کے لیے مجتمع ہو کر جدوجہد کریں۔ اس کا بھلا اللہ خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا اور اواخر ۱۹۶۷ء میں جماعت اسلامی سے علیحدہ ہونے والے بعض احباب کا ایک اجتماع رحیم یار خاں میں منعقد ہوا جس میں ایک نئی دینی تنظیم کے قیام کا فیصلہ کر لیا گیا۔ اس اجتماع میں مولانا بھی شریک تھے اور انہوں نے اس موقع پر بھی حسبِ عادت نہایت فراخ دلی سے ان لوگوں کو خراج تحسین اور ہدیہ تحریک پیش کیا تھا جنہوں نے انہیں بھولا ہوا سبق یاد دلانے کی کوشش کی تھی۔ ان کے مندرجہ ذیل الفاظ راقم نے ستمبر اکتوبر ۱۹۶۷ء کے 'شقائق' کے کور پر نمایاں حیثیت سے شائع کیے تھے :

”عزیز بھائیو!

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے آپ نے ایک جماعتی نظم کے قیام کی قرارداد پر اتفاق کر لیا۔ میں اس پر مسکراتے ہوئے ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کام کے لیے عزم و ہمت عطا فرمائے اور ہر قدم پر ہماری دست گیری اور رہنمائی فرمائے۔ میں اس موقع پر آپ کے سامنے یہ اعتراف کرتا ہوں کہ ہر چند اس کی ضرورت اور اہمیت مجھ پر واضح تھی لیکن میں دو سبب سے اس قسم کی کسی ذمہ داری سے گریز کرتا رہا۔ ایک تو یہ کہ اب میرے قومی ضعیف ہو رہے ہیں کوئی بھاری بوجھ اٹھانا میرے لیے ممکن نہیں رہا۔ دوسرا یہ کہ زندگی کے آخری دور کے لیے اپنے ذوق کے مناسب جوا کم میں نے تجویز کر لیا تھا اب وقت و فرصت کا لمحہ لمحہ اسی پر صرف کرنا چاہتا تھا چنانچہ دوستوں کے شدید اصرار بلکہ دباؤ کے باوجود میں خود اس کے لیے پھل کرنے کی ہمت نہیں کر سکا۔ دوستوں نے جب کبھی اس فرض کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی، میں ان کے دلائل کا تو انکار نہ کر سکا لیکن اپنی کمزوریوں اور مجبوریوں پر نگاہ کر کے ان کی بات کو ٹالتا ہی رہا میں یہ بھی محسوس کرتا رہا کہ اگرچہ میرے اوقات تمام تردیدی و علمی کاموں ہی میں بسر ہو رہے ہیں تاہم معاشرے سے متعلق مجھ پر جو فرض عائد ہوتا ہے اس میں مجھ سے کوتاہی ہو رہی ہے جس کے سبب سے نہ صرف میری بعض صلاحیتیں سکڑ رہی ہیں بلکہ اندیشہ اس بات کا ہے کہ اس پر مجھ سے مواخذہ ہو۔ ان تمام احساسات کے باوجود میں اپنے آپ کو معذرت سمجھتا رہا جس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ آدمی اپنے آپ کو معذرت سمجھنے میں بڑا فیاض ہوتا ہے۔

بہر حال اب میں پورے صبر و تحمل کے ساتھ اس کام میں شریک ہوتا ہوں اور ان تمام دوستوں کا دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے اس عظیم فرض کی اہمیت کو سمجھا اور ہم سب کو اس کے اہتمام کا اہتمام کیا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی طرف سے ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین حسن صلاحی۔

لیکن افسوس کہ سابقہ تمام مساعی کی طرح یہ کوشش بھی بالکل بے اثر نہ پائے تھے کہ گرفتار

ہم ہوئے، بکے سے انداز میں ناکام ہو کر رہ گئی۔

یہ دور راقم کی زندگی میں ایک اہم موڑ (TURNING POINT) کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے کہ اس وقت راقم نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اب کسی بڑے، کی طرف دیکھنے کی بجائے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونا ہے۔ اور کوئی چلے نہ چلے اور ساتھ دے نہ دے تنہا چلنا پڑا تب بھی سفر کا آغاز بہر حال کرنا ہے۔ گویا ۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۷ء دس سال مولانا مودودی کے ساتھ اور ۱۹۵۸ء تا ۱۹۶۸ء دس سال مولانا اصلاحی کے ساتھ راقم کلّیہً و کالمہً وابستہ رہا۔ لیکن ۱۹۶۸ء سے (لگ بھگ چھٹیس برس کی عمر میں) اس نے آزادی کے ساتھ اپنی ڈگر پر چلنے کا فیصلہ کر لیا۔ تاہم بحمد اللہ راقم اپنے مہی سے منقطع نہیں ہوا اور اس نے ایکٹ جانب حلقہ ہائے مطالعہ قرآن پر اپنی تمام تر ساعی صرف کردی اور ان کے ذریعے اصلاً قرآن کی اس انقلابی دعوت کا پرچار کیا۔ جس کے تبصیر میں موجودہ صدی کے دینی اول تھے مولانا ابوالکلام آزاد اور جس کے تسلسل کو برقرار رکھا تھا مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اور دوسری جانب دارالاشاعت الاسلامیہ کے ذریعے اپنے جملہ وسائل و ذرائع کو کھپا دیا مولانا فرہیؒ اور مولانا اصلاحی کی تصانیف کی اشاعت کے ذریعے تدبیر قرآن کے اس اسلوب کی ترویج و اشاعت میں جس کے بانی ہیں مولانا حمید الدین فرہیؒ اور شارح ہیں مولانا امین احسن اصلاحی — لیکن اب چونکہ راقم کسی ایک لکیر کا فقیر نہیں رہا تھا لہذا اس کی سوچ کے دوسرے اجزائے ترکیبی بھی سننے آنے لگے۔ اور ۱۹۶۸ء سے ’یقیناً‘ میں ’افادات فرہیؒ‘ اور ’تدبیر قرآن‘ کے ساتھ ساتھ نہ صرف مولانا سندھی مرحوم کے تذکرے اور ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم کے منشور اسلام، بلکہ مولانا ابوالحسن علی ندوی کے ”ربانیہ لا دہبانیہ“ اور پروفیسر یوسف سلیم چشتی کے ”حقیقت تصوف“ اور تاریخ تصوف اسلامیؒ ایسے مضامین کو بھی جگہ ملنے لگی۔ اور یہی مولانا اصلاحی کی راقم المحروف کی جانب سے گزرنی طبع کا سبب اول بن گئی۔ اس لیے کہ مولانا بر ملا فرمایا کرتے ہیں کہ ”میں تصوف کو کل کا کل ضلالت مگر ابھی سمجھتا ہوں! چنانچہ مولانا نے راقم سے مشفقانہ انداز میں فرمانا شروع کیا کہ ”عزیزم! تمہارے بارے میں مجھے دو اندیشے لاحق ہیں۔ ایک یہ کہ تم انتہائی ذہین ہو اور دوسرے یہ کہ تمہارے اندر تصوف کی لٹک موجود ہے! راقم اسے منہس کر ٹال دیتا رہا اور مولانا کی مروت و شرافت کہ وہ تعلقات کو اپنے بعض شاگردوں اور احباب کی شدید سرگزانی کے علی الرغم نباہتے رہے!

سختی کے دوران ادھر تو مولانا علیل ہو گئے اور ان کی علالت تشویشناک صورت اختیار کر گئی اور ادھر راقم کے حلقہ ہائے مطالعہ قرآن وسعت اختیار کر گئے اور اُس کے اعوان و انصار کا ایک خاصا بڑا حلقہ وجود میں آگیا اور بالکل فطری طور پر کسی باقاعدہ ادارے کے قیام کی ضرورت محسوس ہوئی جس کے تحت کم از کم مالی امور منضبط کیے جاسکیں۔ یہی ضرورت تھی جس کے تحت مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے قیام کا فیصلہ ہوا۔ راقم اس سے بہت پہلے گہرے غور و خوض کے بعد اس حتمی نتیجے تک پہنچ چکا تھا کہ کسی دینی تنظیم میں شورا ایت اُس جمہور ترقی پرز کی نہیں ہونی چاہیے جس میں بقول علامہ اقبال مرحوم ع ”بندوں کو گنا کرتے ہیں تو لانا نہیں کرتے“ بلکہ اُس طرز کی ہونی چاہیے جو اسلام کے نظام امارت کے ساتھ مناسبت رکھتی ہو جس میں امیر صرف دستور و صدر نہیں بلکہ صاحب امر ہوتا ہے۔ چنانچہ بلا خوف و ہمت لائبریری راقم نے اپنے اس خیال کو تحریر و تقریر دونوں طریقوں پر جاری کیا اور مولانا علیل کی سبک دہی کا بخارہ و عکسوری خاکہ بھی اسی سبج پر تیار کیا۔ اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ جیسے ہی ڈیہانچہ ’میتاق‘ میں شائع ہوا، مولانا بھی بفضلہ تعالیٰ صحت یاب ہو گئے۔ اب جو ان کے علم میں یہ خاکہ آیا تو وہ سخت برہم ہوئے اس لیے کہ اس معاملے میں بھی راقم کی اور ان کی رائے کے مابین بعد ایشترقین پایا جاتا ہے نتیجہ وہ دو طرفہ تعلقات جو بیس سال سے نہایت خوشگوار چلے آ رہے تھے ایک شدید بحران (CRISIS) سے دوچار ہو گئے۔ بعض احباب نے بیچ بچاؤ کی کوشش کی لیکن راقم نے صاف عرض کر دیا کہ اُس کی بھی یہ سوچ سبھی رائے ہے اور اب اس میں تبدیلی صرف اس طرح پیدا ہو سکتی ہے کہ اسے دلیل سے قائل کر دیا جائے محض پاس ادب اور لحاظ بزرگی کی بنا پر وہ اپنی رائے تبدیل نہیں کرے گا۔ چنانچہ ”ہذا فراق بینی و بینک“ کا آغاز ہو گیا اور اس کے پہلے قدم کے طور پر طے پایا کہ ’میتاق‘ کے سرورق پر سے ”زیر سرپرستی مولانا امین احسن اصلاحی“ کے الفاظ حذف کر دیئے جائیں۔ تاہم یہ مولانا کی عالی ظرفی ہے کہ اس کے بعد بھی نہ صرف یہ کہ ذاتی تعلقات برقرار رہے بلکہ جزوی تعاون بھی جاری رہا۔

پانچ سالہ سے انجمن خدام القرآن کی سالانہ قرآن کا نفر نسوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور اس میں راقم نے تقریباً تمام مکاتب فکر کے علماء کو صدارت یا خطاب کے لیے دعوت دی جسے ان کی اکثریت نے ازراہ شفقت و عنایت منظور فرمایا۔ یہ چیز راقم کے اور مولانا کے مابین مزید بعد و فضل کا سبب بن گئی۔

ان کا فرمان یہ تھا کہ ان مولویوں کو سر پر بٹھا کر کیا لینا ہے؟ ان ہی کے خیالات و تصورات کی توہین تردید کرنی ہے، راقم نے اسے بھی خاموشی سے سنا، ان ساکر دیا اس لیے کہ اس کی طبیعت کا رُخ جیسا کہ اوپر تفصیل سے بیان ہو چکا، بالکل دوسرا ہے تاہم اُس نے محسوس کر لیا کہ اب مولانا کے مزاج میں نئی بڑھتی جا رہی ہے۔

جولائی ۴۷ء میں راقم نے اعلان کیا کہ اب وقت آگیا ہے کہ یہ چھوٹی سی تحریک اسلامی جس کا آغاز دعوتِ رجوع الی القرآن سے ہوا تھا اور جس نے پہلی تنظیمی ہیئت انجمن خدام القرآن کی صورت میں اختیار کی تھی اگلے تنظیمی مرحلے میں قدم رکھے اور ٹھیکہ دینی اصولوں پر جماعت کا قیام عمل میں لایا جائے جس کا بیرونی راقم کے پیشِ نظر وہی تھا جو ۴۷ء میں اجتماع رحیم یار خاں میں طے پایا تھا۔ چنانچہ ميثاق کی ستمبر، اکتوبر اور نومبر ۱۹۷۷ء کی اشاعتوں میں راقم نے اپنی جولائی ۴۷ء والی تقریر اور تنظیم اسلامی کا مسئلہ والا خاکہ ایک طویل ادارے سمیت شائع کر دیا۔

اس موقع پر راقم مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا تو مولانا نے جو کچھ فرمایا اس کا حاصل یہ ہے کہ ————— 'پرچمِ ہل ہی ملا تھا، میں نے رات ہی پورا پڑھ ڈالا۔ اور رات کے دو بجے تک لائٹن کی روشنی میں اسے پڑھتا رہا۔ تم نے خلا کی نشاندہی بالکل صحیح کر دی ہے۔ اور کرنے کا کام بھی ٹھیک متعین کر دیا ہے البتہ تم نے بہت بھاری بوجھ اٹھالیا ہے اور ایک بڑی ذمہ داری اپنے سر لے لی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ میرے اندر اس کی ہمت نہ تھی۔ لیکن اب جبکہ تم نے یہ بوجھ اٹھا ہی لیا ہے تو میں ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ تم اس میں ناکام ہو بلکہ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تمہیں کامیاب کرے ————— اس لیے کہ میں ہرگز ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو اگر خود کوئی کام نہیں کر سکتے تو کسی دوسرے کو کرتا بھی نہیں دیکھ سکتے۔۔۔۔۔'

مولانا کا یہی وہ حوصلہ افزا طرزِ عمل تھا جس سے راقم کو جرات ہوئی کہ مارچ ۱۹۷۷ء میں جب تنظیم اسلامی کا باضابطہ قیام عمل میں آیا۔ اور اس کا دستور طے پایا تو اس میں ایک 'مظہرِ مشائخ' بھی رکھا گیا۔ جس کی زبانی اطلاع پر تو مولانا نے شیخ جمیل الرحمن صاحب اور کراچی کے بعض دوسرے رفقاء سے یہ فرمایا کہ "آپ لوگوں نے یہ بالکل ٹھیک فیصلہ کیا ہے یہ خدمت میں بخوشی سرانجام دوں گا، لیکن جب باقاعدہ تحریری صورت میں وہ خاکہ اُن کے سامنے آیا تو انہوں نے اس میں شمولیت سے

انکار فرما دیا۔

اس کے بعد بھی لگ بھگ ایک سال تک مولانا کی خدمت میں راقم کی حاضری کا سلسلہ جاری رہا جنوری ۱۹۴۷ء میں قرآن اکیڈمی کی تعمیر کے آغاز کا مرحلہ آیا اور ساتھیوں نے اس موقع پر ایک اجتماعی دعا کا پروگرام بنایا تو اس میں شرکت کی دعوت راقم نے مولانا کو بھی دی جسے انہوں نے کمال شفقت و مروت سے منظور فرمایا۔ اور وہ اپنے غویش کلاں نعمان علی صاحب کی معیت میں تشریف لائے لیکن بعد میں بعض حضرات سے سننے میں آیا کہ مولانا نے فرمایا کہ میری طبیعت بالکل آمادہ نہ تھی لیکن جب اس نے کہا تو میں انکار نہ کر سکا اور مجبوراً شریک ہو گیا۔ راقم کی اصل مشکل یہ تھی کہ مولانا سے ملنا جلتا بھی ہوا اور پھر انہیں اپنے کاموں میں شرکت کی دعوت نہ دی جائے تو اس کے لیے یہ ہیں کہ رہے ہیں اس کو خود راقم نے ختم کر دیا۔

اسی پس منظر میں راقم نے مارچ ۱۹۴۷ء میں تیسری سالانہ قرآن کانفرنس میں شرکت کی دعوت مولانا کو دی اور حسب سابق اسے بھی مولانا نے منظور فرمایا لیکن بعد میں اپنے بعض دوستوں اور شاگردوں کے اصرار پر شرکت سے انکار کر دیا۔ یہ گویا ان دو طرفہ تعلقات کے ضمن میں اونٹ کی کمر پڑ آخری تنکا ثابت ہوا اور راقم نے فیصلہ کر لیا کہ آئندہ مولانا کی خدمت میں حاضری کا سلسلہ بھی بند کر دیا جائے تاکہ وہ بار بار اس طرح کی پریشان کن صورت حال سے دوچار نہ ہوں۔ اور اس طرح رجب ۱۳۶۷ھ پر پھیلے ہوئے وہ تعلقات اختتام پذیر ہو گئے جو پورے بیس سال نہایت گرم جوشی کے ساتھ قائم تھے اور بعد ازاں ”گھنڈرتا رہے ہیں عمارت عظیم تھی“ کے مصداق پورے پانچ سال میں رفتہ رفتہ کم ہو کر اس حد کو پہنچے کہ وہی صورت پیدا ہو گئی کہ

بس اتنا سا تعلق اب ان سے رہ گیا ہے وہ مجھ کو جانتے ہیں، میں ان کو جانتا ہوں!

پس نوشت

کتاب کے حصہ دوم کے آخری دو باب یعنی باب سوم و چہارم، اولاً، میثاق، دسمبر ۱۹۷۶ء میں ایک مسلسل تحریر کی صورت میں شائع ہوئے تھے۔ اس پر جو حوصلہ افزا آئندہ تحسین بے شمار حضرت کی جانب سے موصول ہوئی ان میں سے دو بزرگوں کی قدر افزائی راقم کے لیے سرمایہ حیات کا درجہ رکھتی ہے۔

چنانچہ مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ نے ایک ملاقات میں نہ صرف یہ کہ اس تحریر کی کامل تصویب فرمائی بلکہ اپنی دو عربی تصانیف بھی بدیہ فرمائیں جن میں سے ایک بعض جدید تفاسیر پر نقد و جرح ہی پر مشتمل تھی۔

دوسری تحریر سید محمد حسین مولانا عبدالملک جامعی مدظلہ، مباحثہ مدینہ کی جانب سے ایک خط کی صورت میں موصول ہوئی تھی جو مارچ ۱۹۷۷ء کے میثاق میں کور کے اندرونی صفحے پر ”بریدِ حریم“ کے عنوان سے شائع کر دیا گیا تھا۔ (جس کا عکس اگلے صفحے پر ملاحظہ کیا جاسکتا ہے) اس میں انہوں نے جو ذاتی تاثرات بیان فرمائے ان پر مستزاد میرے لیے نہایت مسرت انگیز بات یہ تھی کہ ”ذکر میرا“ مجھ سے بہتر ہے کہ اس مضمون میں ہے!“ کے مصداق اس تحریر کا ذکر مدینہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ کی محفل میں ہوا جیسے کہ مولانا جامعی کے خط سے ظاہر ہے اس سے قبل میرا ان سے کوئی تعارف نہ تھا۔ البتہ بعد میں ان سے جو دو ایک ملاقاتیں ہوئیں ان میں تفصیل معلوم ہوئی کہ جب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ ملاقات کے لیے حضرت شیخ الحدیث کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے دریافت فرمایا کہ یہ تحریر ان کی نظر سے گزری ہے یا نہیں؟ اور جب جواب نفی میں ملا تو ارشاد فرمایا: ”یہ میثاق نے جاؤ اور اسے ضرور پڑھو لیکن پڑھنے کے بعد پرچہ مجھے واپس کرنا نہ بھولنا!“ میرے لیے مولانا بنوریؒ اور شیخ الحدیثؒ کی یہ قدر افزائی اس اعتبار سے بہت وقیع و اہم ہے کہ

أَحِبُّ الصَّالِحِينَ وَأَنَا مِنْهُمْ

لَعَلَّ اللَّهَ يَرْزُقُنِي صَلاَحًا